بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

پاکستان جس تحریک کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا اُس کے نعروں، خطبوں اور لٹریچر کو دیکھ کر ملک اور بیرون ملک کا ہر شخص اس بات کا متوقع تھا کہ یہ مملکت وجود میں آتے ہی آپ سے آپ اُس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرے گی جسے دس سال تک دنیا بھر کے سامنے بانگِ دہل اس کے قائدوں اور حامیوں نے اپنا نصب العین قرار دیا ہے یعنی اسلامی نظامِ زندگی کا احیاء اور اسلامی قوانینِ حیات کا اجراء۔ کوئی شخص بھی یہ توقع نہ رکھتا تھا کہ منزلِ مقصود کو پہنچتے ہی وہی چیز مابہ النزاع بن جائے گی جسے اس شد و مد کے ساتھ مقصد ٹھیرایا گیا تھا اور جس کے لیے کروڑوں مسلمانوں سے سر دھڑ کی بازی لگوائی گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ عجوبہ پیش آیا اور ہمارے کارفرماؤں نے ساری دنیا کے سامنے اپنی سیرت کے اس ناقابلِ فخر پہلو کو روشن کر کے رکھ دیا کہ وہ کس بے باکی کے ساتھ قول اور عمل کے تضاد کا اظہار کر سکتے ہیں اور کس بے دردی کے ساتھ خود اپنی قوم سے فریب کاری کر سکتے ہیں۔

تاریخِ پاکستان کے ابتدائی آٹھ سال جس کشمکش میں گزرے ہیں اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگست سنہ ۴۷ء سے مارچ سنہ ۴۹ء تک ساری قوم چیختی رہی کہ اپنی مملکت کے اس نصب العین کا آئینی طور پر اعلان کیجیے جس کی امید دس سال سے آپ ہم کو دلا رہے تھے اور جس کی امید دلا کر ہی آپ نے اِس مملکت کے قیام کی خاطر ہم کو آگ اور خون کی بازی کھیلنے پر آمادہ کیا تھا۔ ایک مخلص اور ایماندار قیادت کو جو کام خود کرنا چاہیے تھا اس کے لیے قوم کی طرف سے مطالبے کی ضرورت پیش آنا ہی کچھ کم شرمناک نہ تھا کجا کہ اسے ٹالنا اور دبانے کی کوششیں کرنا اور اس کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی چالیں چلنا۔ مگر افسوس کہ یہ سب کچھ ہوا اور اس حد تک ہوا کہ قوم کا وہ حسنِ ظن بری طرح مجروح ہو گیا جو وہ اپنے رہنماؤں سے رکھتی تھی۔ آخر کار جب تمام تدبیروں کے باوجود یہ مطالبہ نہ دبا تو قیامِ پاکستان کے پورے ۱۹ مہینے بعد قراردادِ مقاصد پاس کی گئی جس میں مملکت کے اسلامی نصب العین کا اقرار و اعلان تھا۔

یہ بات کہ قراردادِ مقاصد میں اس مملکت کے لیے اسلام اور اُس کی تعلیمات کو بنیادِ آئین تسلیم کر لیا گیا تھا اس کے

الفاظ سے ظاہر تھی، اُن تقریروں سے ظاہر تھی جو اُسے پاس کرتے وقت مجلس دستور ساز میں کی گئیں، اُن تصریحات سے ظاہر تھی جو ذمہ دار ترین لوگوں نے اُس کے بعد ملک اور بیرونِ ملک میں کیں، اور اِس بات سے ظاہر تھی کہ پاکستان، ہندوستان، دنیائے اسلام اور امریکہ و یورپ میں ہر جگہ اس کا یہی مطلب سمجھا گیا۔ چند لوگ اگر اس کے اندر اپنے کچھ ذہنی تحفظات رکھتے بھی ہوں تو وہ ان کے اپنے ذہن تک محدود تھے۔ دنیا کے عام لوگوں نے اس کو جس معنی میں لیا وہ وہی تھے جو علانیہ اُس سے مترشح ہو رہے تھے۔ اِس کے بعد بجا طور پر یہ توقع کی گئی اور فطرتاً یہی توقع ہونی بھی چاہیے تھی کہ پاکستان کی نظریاتی نزاع اب ختم ہو چکی ہے اور اس کا آئینی نصب العین اب طے ہو گیا ہے۔

لیکن بہت جلدی یہ بات کھل گئی کہ جس چیز کو طے شدہ سمجھا گیا تھا وہ طے نہیں ہوئی اور ایک صریح تصفیہ ہو جانے پر بھی اصل نزاع جوں کی توں قائم ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس کے طے ہو جانے کے آثار کہیں نظر نہ آ رہے تھے، بلکہ اس کے برعکس ملک میں ہر طرف یہ بحث چھیڑی اور چھڑوائی جا رہی تھی کہ پاکستان کو اسلامی ریاست ہونا چاہیے یا نہیں، اور اس کے فائدے اور نقصان کیا ہیں، اور "اسلامی ریاست" سرے سے کسی چیز کا نام ہے بھی یا نہیں، اور جس اسلام کے متعلق مختلف فرقوں اور گروہوں کے نظریات اتنے مختلف ہیں اس کا کوئی متفق علیہ دستور ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ان بحثوں کے ذریعہ سے جب قوم کے ذہن کو ۔۔۔ کسی غیر قوم کے نہیں اپنی ہی قوم کے ذہن کو ۔۔۔ خوب پراگندہ کر دیا گیا تو قراردادِ مقاصد کے اٹھارہ انیس مہینے بعد (ستمبر ۵۰ء میں) دستوری سفارشات کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا جو اسلام کے ہر نشان سے خالی تھا۔ اس کارروائی نے ساری قوم میں پھر ایک ہیجان پیدا کیا۔ قوم کے ہر طبقے نے ان سفارشات کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ وہی ہاتھ جنہوں نے اُن کو جنم دیا تھا اُنہیں دفن کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ یہ دوسرا موقع تھا جب ایک عنصرِ قلیل کو چھوڑ کر ساری قوم نے اپنے کارفرماؤں کو بالاتفاق یہ جتا دیا کہ پاکستان کا جو نصب العین اس کے سامنے خود انہوں نے پیش کیا تھا اور جس کا باقاعدہ اعلان خود وہ قراردادِ مقاصد میں کر چکے ہیں، اس سے ہٹنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

اس کے بعد پھر ایک کشمکش شروع ہوئی جو اٹھائیس انتیس مہینے مسلسل چلتی رہی۔ اس دوران میں ایک طرف سے اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے ذہن کو پراگندہ کرنے اور طرح طرح کے اختلافات کو اُبھارنے کی کوششیں کی گئیں اور دوسری طرف

سے تمام مختلف الخیال گروہوں کے معتمد علماء نے پورے اتفاق کے ساتھ اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کا ایک مجموعہ مرتب کر کے پیش کر دیا جس کے بعد یہ عذر پیش کرنے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی کہ اسلامی ریاست کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کے اصول مسلمانوں میں متفق علیہ نہیں ہیں۔ آخر کار دسمبر ۵۲ء میں اس وقت کی مجلس دستور ساز نے ملک کے آئندہ دستور کے لیے بنیادی اصولوں کا ایک دوسرا خاکہ پیش کیا جو پچھلی دستوری سفارشات سے بہت مختلف تھا۔ اس خاکے میں بہت سی وہ باتیں شامل تھیں جو اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں، اور کچھ باتیں اس کی ضد بھی تھیں جن کا اسلام اور اس کے خصائص سے کوئی جوڑ نہیں ہے تاہم یہ غنیمت سمجھا گیا کہ کچھ اسلام مان لیا گیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اسے رد نہ کیا بلکہ صرف اس میں کم سے کم ضروری ترمیمات کا مطالبہ کیا، اور جنوری ۵۳ء میں مختلف الخیال گروہوں کے علماء نے دوبارہ جمع ہو کر قریب قریب پورے اتفاق کے ساتھ وہ ترمیمات بھی مرتب کر دیں جن کے بعد یہ خاکہ قابل قبول ہو سکتا تھا۔

اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نزاع کے تصفیہ کی منزل قریب آگئی ہے۔ بہت تھوڑا اختلاف تھا جو بحث و تمحیص اور گفت و شنید سے رفع ہو سکتا تھا۔ امیدیں بندھ چلی تھیں کہ بنیادوں پر متفق ہو جانے کے بعد جلدی ہی ملک کا نیا دستور بن جائیگا اور پوری قوم کی متحدہ طاقت اس مملکت کی تعمیر نو میں مشغول ہو جائیگی۔ لیکن ٹھیک اس نازک موقع پر تحریک ختم نبوت کے "راست اقدام" کا ہنگامہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھانے والے بھی سب کو معلوم ہیں اور اٹھوانے والوں کا راز بھی کچھ چھپا نہیں رہ گیا ہے۔ معاملے کے اس خاص پہلو پر روشنی ڈالنے کی اب کوئی خاص حاجت نہیں۔ یہاں دیکھنے کے قابل صرف یہ چیز ہے کہ اس ہنگامے کا ردِ عمل صرف بد امنی رفع کرنے اور "راست اقدام" کا قلع قمع کرنے تک محدود نہ رہا بلکہ یہ اس ملک میں ایک خاص عنصر کی ڈکٹیٹر شپ کے قیام کا بہانہ بن گیا۔ اپریل ۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۱۰ کے جس الوکھے مفہوم کا سہارا لیکر برخاست کیا گیا اس کی بدولت حکومت کا اصل اقتدار وزارت اور پارلیمنٹ کے ہاتھوں سے نکل کر اس گورنر جنرل کے ہاتھوں میں چلا گیا جو باشندگان ملک کا منتخب کردہ نہیں بلکہ ملکۂ برطانیہ کا مقرر کردہ تھا، اور اسے یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ ملک کے انتظام کی باگ ڈور جس سے چاہے چھین لے اور جسے چاہے سونپ دے۔ ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام میں اتنی بڑی تبدیلی، جو حقیقت میں ملک کی آزادی

ہی کو بے معنی کر دینے والی تھی، ایک شخص تنہا اپنے بل بوتے پر نہ کر سکتا تھا۔ اس کے لیے ناگزیر تھا کہ اُس کی پُشت پر کار پردازانِ حکومت کی تائید ہو، اور اس تائید کے معنی یہ تھے کہ اقتدار اصل نمائندگانِ ملک سے سلب ہو کر ایک شخص کی طرف نہیں بلکہ ملازمینِ حکومت کے بالائی طبقے کی طرف منتقل ہوا۔ یہ تھا وہ نادر موقع جو تحریکِ ختمِ نبوت کے "راست اقدام" نے فراہم کر دیا۔ اس انقلاب کے پیچھے کیا مقاصد کام کر رہے تھے، اسے یا تو خدا جانتا ہے یا پھر خود انقلاب کرنے والے۔ مگر اس کے بعد فوراً ہی جو چیز سامنے آئی وہ یہ تھی کہ پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانے کے ارادے کھلم کھلا ظاہر کیے جانے لگے اور اصل دستور کی تدوین ملتوی کر کے ایک عبوری دستور کا تخیل پیش کر دیا گیا تاکہ بنیادی اصولوں کی اُس رپورٹ سے پیچھا چھڑایا جا سکے جسے خواجہ ناظم الدین نے پیش کیا تھا۔

اس موقع پر قوم کا ضمیر پھر بیدار ہوا۔ لادینی ریاست کے تخیل کی عام مخالفت کی گئی۔ عبوری دستور کی تجویز کو بھی شدت کے ساتھ رد کر دیا گیا اور قوم کی متفقہ خواہش نے مجلس دستور ساز کو مجبور کر دیا کہ خواجہ ناظم الدین کی رپورٹ ہی کو بنیاد بنا کر دستور کی تیاری کا کام شروع کیا جائے۔ سنہ ۱۹۵۴ء کا بڑا حصہ اس کام میں صرف ہوا۔ ناظم الدین رپورٹ میں اہم ترمیمات کی گئیں جو زیادہ تر اُن ترمیمات کے مطابق تھیں جو جنوری سنہ ۵۳ء میں علماء نے تجویز کی تھیں۔ ساری نزاع سمٹ کر تین چار نکات تک محدود رہ گئی تھی، اور ان میں ایک نکتہ اہم ترین تھا یعنی یہ کہ مملکت کے مالیات پر قانونِ شریعت کا اطلاق کس طرح ہو۔ مجلس دستور ساز ابتدائی کام مکمل کر چکی تھی۔ دستور کا مسودہ تیار ہو چکا تھا۔ اور اس وقت کا وزیر اعظم اعلان کر چکا تھا کہ سال کے اختتام تک اس کی منظوری کے تمام مراحل طے کر کے دسمبر کے آخر میں نیا دستور نافذ کر دیا جائے گا۔ اس طرح یہ توقع قائم ہو گئی تھی کہ سات برس سے جو نظریاتی نزاع ملک میں برپا ہے وہ اب ایک قابلِ اطمینان تصفیے پر ختم ہوا چاہتی ہے۔ مگر اکتوبر سنہ ۵۴ء کی ایک شام یکایک یہ خبر لائی کہ گورنر جنرل بہادر نے سرے سے دستور ساز اسمبلی ہی توڑ دی۔ یہ دوسرا انقلاب اپریل سنہ ۵۳ء کے انقلاب سے عظیم تر تھا جس نے مملکت کے پورے نظامِ قانون کی چولیں ہلا دیں، ملک کو آئینی ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر ناگہانی تغیرات کی موجوں پر ڈال دیا، پاکستان کے وقار و اعتماد کو دنیا بھر میں متزلزل کر ڈالا، اور پیشہ ور سیاست بازوں کی نااتفاقیاں سات برس میں جو خرابی برپا نہ کر سکی تھیں وہ ملازمت پیشہ سیاست بازوں نے آنِ واحد میں برپا کر کے رکھ دی۔ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون سے مقدس جذبات تھے جو اپنے

بھی وطن کو اتنے بڑے خطرات میں ڈال بیٹھنے کے حقیقتاً محرک ہوئے۔ مگر اس انقلابی کارروائی کے مابعد جو آوازیں سننے میں آئیں وہ یہ تھیں کہ امریکی طرز کا ایک دستور نمائندگان ملک کے ذریعہ سے مدوّن نہیں بلکہ ایک فرمانِ مبارک کے ذریعہ سے مسلط کیا جائیگا، اور یہ کہ اسلامی ریاست نہ کبھی بنی ہے نہ بن سکتی ہے، مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، مذہبی لوگ اگر اللہ اللہ چھوڑ کر سیاست میں دخل دیں گے تو کیفرِ کردار کو پہنچائے جائیں گے، بلکہ شاید ان کا پارسل بھی کہیں روانہ کیا جانے والا تھا۔

چند مہینے کی سخت رسوا کن مقدمہ بازی کے بعد آئینی قلابازیوں کا سلسلہ آخرکار جس چیز پہ جا کر ٹھیرا وہ نئی دستور ساز اسمبلی کا قیام ہے۔ اس اسمبلی کے ارکان کا انتخاب باشندگانِ ملک نے دستور بنانے کے لیے نہیں کیا ہے بلکہ اسے اُن صوبائی اسمبلی کے ممبروں نے منتخب کیا ہے جن کے انتخاب میں دستور سازی کا مسئلہ سرے سے زیرِ بحث ہی نہ تھا۔ اس لیے یہ اسمبلی اس دعوے کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی کہ اسے باشندگانِ ملک نے اِس کام کا مجاز کر دیا ہے۔ پھر یہ اسمبلی مکمل طور پر با اختیار ادارہ بھی نہیں ہے۔ انڈی پنڈنس ایکٹ کی نئی قانونی تعبیر ملکہ برطانیہ کے نمائندے کو مالک الملک بنا چکی ہے اور اس اسمبلی کا وجود و عدم اُس کی مرضی پر منحصر ہے۔ مزید برآں اس اسمبلی کے تیار کیے ہوئے دستور کی حیثیت ایک معروضے سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک فردِ واحد اسے قانون کی حیثیت بھی دے سکتا ہے اور ردی کی ٹوکری میں بھی پھینک سکتا ہے۔ نئی قانونی تعبیر نے یہ اختیارِ مطلق اُسی ملکہ برطانیہ کے نمائندے کو سونپا ہے۔ یہ سب خرابی کی صورتیں اس اسمبلی کی تعمیر میں مضمر ہیں۔ اس پر بھی ملک نے صبر و شکر کے ساتھ اسے صرف اس لیے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے کہ ایک فرمانِ مبارک کے ذریعہ نازل شدہ دستور سے بہر حال یہ بہتر ہے کہ یہ کام اُن لوگوں کے ہاتھوں ہو جو پوری نہ سہی ادھوری ہی نمائندہ حیثیت رکھتے ہوں۔

گزشتہ ماہ جولائی میں اس اسمبلی کے اجلاس شروع ہوئے۔ اس موقع پر اس کے ارکان کو توجہ دلائی گئی کہ سابق دستور ساز اسمبلی جو کام کر چکی ہے اس پر پانی نہ پھیرا جائے۔ طے شدہ امور کو پھر سے مابہ النزاع بنا دینا کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ اسلام کے جو اصول وہ مان چکی تھی، اور جمہوریت کے لیے جو تحفظات اس نے تسلیم کر لیے تھے، اُن کو آپ

جوں کا توں رہنے دیں، اور اب صرف اس کمی کو پورا کرنے کی فکر باقی رہ گئی ہے۔ یہ گذارش ہم دو اصحاب نے اسی وقت قبول کر لی اور ان کا مشترکہ بیان ملک کے اخبارات میں شائع ہو گیا۔ بعد میں چند مزید اصحاب نے اس بیان پر دستخط ثبت فرمائے۔ اس طرح اسمبلی کے تقریباً نصف ارکان تحریری صورت میں یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ پچھلی اسمبلی کے تیار کردہ مسودۂ دستور کی اسلامی و جمہوری دفعات کو برقرار رکھنے کے حق میں ہیں، اور جو کمی اس میں رہ گئی ہے صرف اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان اصحاب میں متحدہ محاذ کے تیرہ چودہ اصحاب (جن میں نمایاں ترین نام مولوی فضل الحق صاحب کا ہے) اور مسلم لیگ کے چوبیس پچیس اصحاب شامل ہیں۔ مگر اب جو خبریں پردے کے پیچھے سے چھن چھن کر آرہی ہیں وہ یہ ہیں کہ نیا دستوری خاکہ ان تمام اسلامی دفعات سے خالی ہے جو پچھلی اسمبلی میں طے ہوئی تھیں اور اسلام کا جو تھوڑا بہت نام و نشان اس میں پایا جاتا ہے اُسے بھی خارج کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مخلوط انتخاب کی تجویز اس پہ مزید، اور قرارداد مقاصد تک کو اڑا دینے کی افواہیں اس پہ مزید علی المزید ۔۔۔۔۔ اب یہ بات کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے کہ جن لوگوں نے ناظم الدین رپورٹ کی آمد سے کئی مہینے پہلے ایک ہنگامہ برپا کرنے کی تیاریاں کی تھیں وہ پھر چند مہینوں سے ایک نیا فتنہ اٹھانے میں کیوں سرگرم ہیں اور اس مرتبہ ان کی توپوں کا رُخ براہِ راست جماعت اسلامی کی طرف کیوں ہے۔

جب تک یہ نیا خاکہ شائع نہ ہو اس کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا تو ہمارے نزدیک ایک بے جا جلد بازی ہے لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر خدانخواستہ یہ خاکہ ویسا ہی ہے جیسا بیان کیا جاتا ہے تو پچھلے آٹھ سال کی داستان پر یہ تازہ اضافہ گویا ذلت کے سر پر رسوائی کا تاج ہے۔

اس ہشت سالہ روداد پر جو شخص بھی غور کرے گا اس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ اس ملک میں خود مسلمانوں کا ایک نہایت با اثر طبقہ ایسا موجود ہے جو ساری قوم کے علی الرغم اسلامی ریاست کے تخیل کی مزاحمت کر رہا ہے اور اسے یہ چیز اتنی ناگوار ہے کہ وہ اسے زک دینے کے لیے اخلاق، دیانت اور حب وطن کے کسی تقاضے کو بھی پامال کر دینے میں باک نہیں رکھتا۔ اس صورت حال میں ملک اور اس کے باشندوں کا، اور خود ان حضرات کا بھی ایک خیر خواہ مجبور ہے کہ چند باتیں پوری صفائی کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کر دے:-

پہلی بات یہ ہے کہ آپ لوگ بھی آخر غیر مسلم تو نہیں ہیں۔ خدا اور رسول اور قرآن کو مانتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں

کہ ایک دن بہرحال مرنا ہے اور خدا کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے خدارا غور کیجیے کہ اس ملک کے مستقبل اور یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی جو بھاری ذمہ داری آپ پر عائد ہو گئی ہے اس کو آپ کس طرح انجام دے رہے ہیں اور اس کے لیے خداوند عالم کے سامنے کیا جواب دہی کریں گے۔ کیا اُس احکم الحاکمین کی عدالت میں یہ بات معاف ہو جائیگی کہ جس وقت اپنے ملک کے لیے اسلامی نظامِ زندگی اور غیر اسلامی نظامِ زندگی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں تھا اُس وقت آپ نے پہلی چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو قصداً پسند کیا؟ اور کیا یہ بات بھی معاف ہو جائیگی کہ غیر مسلم اقتدار سے نکلنے کے بعد جو قوم اسلام کی طرف پلٹنا چاہتی تھی اُس کا راستہ آپ روک کر کھڑے ہو گئے؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ طاقت کے بل پر اپنی مرضی کا نظامِ زندگی مسلط کر بھی دیں تو یہ امید نہ رکھیے کہ وہ کبھی کامیابی کے ساتھ چل سکے گا۔ بالفرض اگر قوم کی طرف سے کوئی کھلی مزاحمت نہ بھی ہو تو ایک گہری غیر محسوس دائمی مزاحمت برابر کام کرتی رہے گی۔ عام مسلمانوں سے آپ بہرحال قرآن کی تلاوت اور رسولِ پاک اور صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کی سیرتوں کا مطالعہ نہیں چھڑوا سکتے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق اور ابتدا سے لیکر آج تک کے مفکرین اسلام کا پیدا کیا ہوا لٹریچر نہیں گم نہیں کر سکتے، اور مسلمان کے دل و دماغ سے یہ ذہنیت بھی کھرچ کر نہیں پھینک سکتے کہ وہ اس سارے ذخیرے کو احترام کی نگاہ سے دیکھے اور حق و باطل کی تمیز کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے۔ یہ پورا ذخیرہ اُس کو ہر وقت یہ بتاتا رہیگا کہ اسلام کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں، اس کی ہدایات کیا ہیں، اُس کی آخرت کا بگڑنا اور سنورنا کن چیزوں پر موقوف ہے، اور ساری امت کے اکابر ہر زمانے میں کس چیز کو مسلمان کا مطمحِ نظر اور طریقِ زندگی قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد جب وہ دیکھے گا کہ اس کا ملک جس میں وہ اسّی فی صدی سے بھی زیادہ اکثریت رکھتا ہے، ایک دوسرے ہی راستے پر چلایا جا رہا ہے تو اپنی ساری اخلاقی کمزوریوں کے باوجود اس کا ضمیر کبھی مطمئن نہ ہو گا۔ آپ رزق کی چاٹ اور فوائد کے لالچ سے اس کو ضمیر کے خلاف چلانے کی جتنی بھی کوششیں کریں گے ان سب کے باوجود وہ بددل رہے گا۔ اور یاد رکھیے کہ ایک بددل قوم کبھی ایک ترقی پذیر ریاست کی تعمیر نہیں کر سکتی۔ اب دو چیزوں میں سے ایک چیز کو انتخاب کرنا ہی پڑیگا۔ ایک یہ کہ اونچے طبقے کے چند خاندان خوشدل ہوں اور باقی ساری قوم بددل رہے۔ اور دوسری یہ کہ چند خاندان بددل ہوں اور باقی ساری قوم اُس راستے پر چلے جس پر وہ ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ چل سکتی ہے۔ فیصلہ کیجیے۔ باقی ص ۱۶۴